مباحثہ ومکالمہ

مولانا سمیع اللہ سعدی*

اسلامی جمہوریت کا فلسفہ

شریعت اور مقاصد شریعت کی روشنی میں (۱)

سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی اصلاح مذہب کی تحریک مغربی دنیا میں انقلابات اور تبدیلیوں کا نکتہ آغاز ثابت ہوئی اور مغربی دنیا انقلاب، تبدیلی، جدیدیت، پرانے تصورات ومفروضات کی بیخ کنی، مذہب پرستی اور کسی مابعد الطبیعی طاقت کو ماننے کی بجائے انسانیت پرستی اور عقل پرستی کی ایک ایسی شاہراہ پر گامزن ہوئی، جس نے حیاتِ انسانی کا ہر شعبہ مکمل طور پر تبدیل کیا۔ مغربی مفکرین وفلاسفہ نے انسانیت پرستی، مساوات، ترقی، آزادی اور عقل پرستی کا نعرہ کچھ اس انداز سے لگایا کہ مغربی دنیا کا ہر فرد اپنے ماضی سے لاتعلقی، مذہب سے بیزاری اور ان مفکرین کے طے کردہ خودساختہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو مکمل طور پر تبدیل کرنے پر آمادہ ہوا۔

مخصوص اسباب اور پس منظر کی بنا پر اس نعرے کی تاثیر اور جاذبیت اتنی زیادہ تھی کہ بقیہ دنیا بھی آہستہ آہستہ مغرب کی ہم نوا بنتی گئی، چنانچہ مغربی مفکرین کے خودساختہ اصولوں کی آفاقیت اور جامعیت ایک طے شدہ اصول اور مسلمہ نظریہ بنتا گیا۔

مغربی دنیا نے اپنے خودساختہ اصولوں اور مسلمات کی بنیاد پر زندگی کا ہر شعبہ از سر نو مرتب کیا۔ آزادی، مساوات، ترقی، عقل پرستی اور انسان کی مکمل خودمختاری کی بنیاد پر حکومت وریاست کے لیے جو نظام تجویز ہوا، وہ لبرل جمہوریت کا تصور تھا۔ لبرل مغربی جمہوریت کی ظاہری ابتدا انقلاب فرانس سے ہوئی، لیکن تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے لیے مغرب کے بنائے ہوئے دیگر نظاموں کی بنسبت لبرل جمہوریت کی مقبولیت کی رفتار کافی سست رہی۔ اور انقلاب فرانس 1789 سے لیکر جنگ عظیم اول 1914 تک صرف چند مغربی ممالک نے لبرل جمہوریت کو ریاست وحکومت کے لیے بطورِ نظام اختیار کیا تھا۔ البتہ جنگ عظیم اول کے نتیجے میں جب خلافت عثمانیہ شکست وریخت کا شکار ہوئی اور خلافت عثمانیہ کے مختلف خطے نافرمان اولاد کی طرح اپنے مرکز سے سازشوں کا شکار ہو کر جدا ہوئے، تو مغرب نے لبرل جمہوریت کو جدید دنیا کے لیئے بطورِ نظام متعارف کروانے کے لئے کوششیں تیز

samiullahjan786@yahoo.com

تر کر دیں۔ سفارتی، سیاسی، عسکری، فکری، غرض ہر سطح پر لبرل جمہوریت کو عام کرنے پر کچھ اس انداز سے محنت ہوئی کہ چند عشروں میں آدھی سے زائد دنیا نے لبرل مغربی جمہوریت کو قبول کیا۔ اقوام متحدہ کے ادارے نے جہاں دیگر مغربی خود ساختہ اصولوں کو آفاقیت عطا کی، وہاں ریاست وحکومت کے لئے لبرل جمہوریت کے نظام کو جدید دنیا کا متفقہ و مسلمہ نظریہ بنایا اور آج اکیسویں صدی میں جمہوریت کو اتنا تقدس، عظمت اور احترام حاصل ہے کہ جمہوریت کے قیام کے لئے اقوام متحدہ دنیا کے ہر ملک میں مغربی اور امریکی جنگ کو قانونی جواز تک فراہم کرتا ہے۔

لبرل مغربی جمہوریت کے بنیادی خدوخال اور اصول

اس سے پہلے کہ لبرل جمہوریت کی اسلام کاری اور اسلامی جمہوریت کے فلسفے پر بحث ہو لبرل مغربی جمہوریت کے بنیادی اصول ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ اس بات کا تجزیہ آسان ہو کہ اسلامی دنیا میں لبرل مغربی جمہوریت کے کن اصولوں کی اسلام کاری کس انداز سے کی گئی اور ان صولوں میں ترمیم وتبدیل سے جمہوریت کا نظام کس طرح اسلامی تعلیمات اور مقاصدِ شریعت کے ہم آہنگ ہو گیا۔

۱۔ عوام کی حاکمیت

لبرل مغربی جمہوریت کا بنیادی اور اساسی رکن عوام کی کلی حاکمیت اور خود مختاری کا تصور ہے کہ کسی بھی ریاست کے عوام کو اپنی مرضی کے قوانین بنانے، اپنی پسند کے نمائندے چننے اور اپنی چاہت وخواہشات کے مطابق اپنے ملک کا نظام چلانے کا مکمل اختیار ہے۔

۲۔ عوامی نمائندوں کا تصور

لبرل مغربی جمہوریت میں عوامی نمائندگی پارلیمنٹ کی شکل میں ہوتی ہے کہ ریاست کے ہر ہر فرد کو چونکہ ملکی معاملات میں شریک کرنا ایک ناممکن سی بات ہے اس لئے اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ ملکی عوام اپنے نمائندے کثرت کی بنیاد پر منتخب کریں گے اور پارلیمنٹ کی صورت میں یہ ارکان عوامی نمائندگی کا فریضہ سرانجام دیں گے۔

۳۔ پارلیمنٹ کے لامحدود اختیارات

لبرل مغربی جمہوریت میں چونکہ پارلیمنٹ ریاست کے جملہ افراد کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے پارلیمنٹ ملک کا سپریم اور طاقت ور ادارہ ہوتا ہے اور ملک میں ہر قسم کی قانون سازی، تبدیلی اور اصلاحات کا اختیار پارلیمنٹ کے ارکان کے پاس ہوتا ہے اور ارکانِ پارلیمنٹ اکثریت کی بنیاد پر ہر قسم کا فیصلہ کرنے اور ہر قسم کی قانون سازی کا مجاز ہوتے ہیں۔

۴۔ آئین ودستور کی بالادستی اور تقدس

لبرل مغربی جمہوریت میں عوامی نمائندے قانون کا ایک مجموعہ مرتب کرتے ہیں جو اس ملک کا آئین اور دستور کہلاتا ہے۔ یہ ملکی دستور عوامی نمائندوں کی کثرت کی بنیاد پر منظور ہوتا ہے۔ آئین کو انتہائی تقدس اور عظمت کا درجہ ملتا ہے اور ملک کا کوئی بھی فرد خواہ وہ صدر ہو یا عام آدمی، دستور اور آئین کے خلاف کسی قسم کی لب کشائی نہیں کر سکتا اور نہ ہی

ملکی عدالتیں دستور اور آئین کے خلاف کسی قسم کا فیصلہ کرسکتی ہیں۔ ملک کے تمام جھگڑوں، تنازعات اور اختلافات میں آئین کو مرجعیت اور فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ بالغ رائے دہی کا تصور اور سیاسی مساوات

لبرل مغربی جمہوریت میں ملک کا ہر بالغ فرد رائے دہی اور ووٹنگ کا اہل ہوتا ہے تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، دیہی علاقے کا ہو یا شہری، اسی طرح ملک کے جملہ افراد کے ووٹ کی یکساں قیمت اور اہمیت ہوتی ہے اور ملک کے کسی بھی فرد کے ووٹ کو دوسرے فرد کے ووٹ پر برتری حاصل نہیں ہوتی۔ نیز ملک کا ہر فرد پارلیمنٹ کا ممبر اور امیدوار بن سکتا ہے۔ بعض ممالک میں مخصوص تعلیم کی اہلیت کی شرط ہے لیکن جمہوریت کی روح اور اس کا فلسفہ یہی کہتا ہے کہ ملک کے ہر فرد کو پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ جمہوریت کی اصطلاح میں اسے سیاسی مساوات کہتے ہیں۔

۶۔ کثرتِ رائے کا تصور

لبرل مغربی جمہوریت میں ووٹنگ کا عمل ہو یا پارلیمنٹ میں قانون سازی تمام فیصلے اکثریت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں اور اکثریت کا فیصلہ حتمی شمار ہوتا ہے اکثریت کے فیصلے سے روگردانی جمہوریت کی بنیادوں سے انحراف سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی کسی جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلے کو رد کرنے کا کسی کو اختیار رہتا ہے۔

۷۔ سیاسی جماعتوں اور حزبِ اختلاف کا تصور

جمہوری نظام میں ملک کے افراد انفرادی حیثیت میں بھی پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے لئے تگ ودو کرسکتے ہیں اور لسانی، علاقائی، طبقاتی نظریاتی اور دیگر اشتراکات کی بنیاد پر ایک جماعت بھی تشکیل دے سکتے ہیں۔ سیاسی جماعت بندی کی کوئی حد متعین نہیں ہوتی۔ پھر انتخابات کے بعد اکثریت جماعت کو حکومت بنانے کا حق مل جاتا ہے اور وہ ملک کا نظم و نسق چلانے کا بیڑا اٹھالیتی ہے۔ جبکہ دیگر جماعتیں حزبِ اختلاف بن جاتی ہیں اور یوں ملک کی سیاسی جماعتیں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔ حزبِ اختلاف کا اصل تصور تو یہ ہے کہ اہلِ اقتدار کے لئے وہ پریشر گروپ کا کردار ادا کرتا رہے تاکہ اہلِ اقتدار حکومت واختیار کے بل بوتے پر ملک وملت کے لئے نقصان دہ معاملات کرنے سے باز رہے لیکن عمومی طور پر جمہوری ملکوں میں حزبِ اختلاف کی وجہ سے پروپیگنڈے، بداعتمادی اور حکومت کے خلاف افواہوں اور تبصروں کا ایک بازار گرم ہوتا ہے۔ نیز سیاسی جماعتوں کی وجہ سے ملک کے عوام ایک دائمی تقسیم کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض ترقی یافتہ جمہوری ملکوں میں دو جماعتی نظام رائج ہے ایک حزبِ اقتدار میں ہوتی ہے جبکہ دوسری جماعت حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتی ہے۔

۸۔ مساوات اور آزادی

جنسی، سیاسی، مذہبی مساوات اور اپنے نظریات اور رائے کے اظہار کی مکمل آزادی جمہوریت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ ریاست کی نظر میں تمام افراد برابر سمجھے جاتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل اور مذہب کی تبلیغ اور نشر

واشاعت کامکمل اختیار ہوتا ہے سب کو یکساں سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔خلاصہ یہ کہ جمہوری نظام کا فلسفہ کہتا ہے کہ ریاست افراد کے درمیان مذہب، جنس یا کسی اور وجہ سے کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کرے گی۔

۹۔مذہب اور ریاست کی علاحدگی یعنی لبرلزم وسیکولرزم

لبرل مغربی جمہوریت کی پوری عمارت سیکولرزم کی بنیاد پر کھڑی ہے۔سیکولرزم کا سادہ اور آسان مفہوم یہ ہے کہ مذہب خواہ کوئی بھی ہو، ریاستی معاملات اور امور میں دخل انداز اور اثر انداز نہیں ہوگا۔مذہب افراد کا نجی معاملہ ہے۔ ریاست کے تمام امور مذہب سے بالکل لاتعلق رہیں گے۔ریاست کے قوانین کے مذہب کی بنیاد پر نہیں بنائے جائیں گے۔

۱۰۔اختیارات کی تقسیم اور حکومت کی مدت

لبرل مغربی جمہوریت میں اختیارات تقسیم ہوتے ہیں۔ملک کا نظم ونسق چلانے کا کام انتظامیہ کے سپرد ہوتا ہے۔ قانون سازی کا فریضہ پارلیمنٹ کا ادارہ سرانجام دیتا ہےاور دستور کے مطابق فیصلے کرنے اور دستور کی تشریح عدالتوں کا کام ہوتا ہے۔یہ تینوں ادارے آپس میں بالکل مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ہر ایک کا اپنا دائرہ کار ہوتا ہے، کوئی دوسرے پر حاکم اور بالا دست نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ جمہوری نظام میں حکومت کی مدت مقرر ہوتی ہے ہر پانچ یا چار سال بعد دوبارہ انتخابات ہوتے ہیں اور ان انتخابات کے نتیجے میں زسرِ نو حکومت بنتی ہے۔

لبرل مغربی جمہوریت کی اسلام کاری کی بحث

لبرل مغربی جمہوریت کی اسلام کاری پر بحث کے لئے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ لبرل مغربی جمہوریت کے بنیادی اصولوں اور اسلامی تعلیمات میں کتنا تضاد ہےاور کتنی ہم آہنگی؟ لبرل مغربی جمہوریت اور اسلامی تعلیمات میں خصوصاً وہ تعلیمات جو حکومت و ریاست سے متعلق ہیں ،مشترک اصول کتنے ہیں؟ ظاہر ہے اگر لبرل مغربی جمہوریت اور اسلامی تعلیمات میں موافقت زیادہ ہےتو اس نظام کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا آسان ہوگا۔ البتہ یہ بات پھر بھی قابل بحث رہے گی کہ جمہوریت کو مکمل اسلامی بنانے کے بعد یہ نظامِ حکومت مقاصد شریعت سے کتنی مطابقت رکھتا ہے؟ اور لبرل جمہوریت کی ''اسلامی شکل'' سے وہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں؟ لیکن اگر جمہوریت کے سارے یا اکثر اصول اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں تو محض ایک یا دو چیزوں میں ترمیم کرنے سے لبرل جمہوریت اسلامی نہیں بن سکتی اور جزوی ترمیم سے اس پر اسلامی کا لیبل لگانا درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ اصول ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی کا آمیزہ غیر اسلامی ہی کہلاتا ہے۔اسی کو ٹھیٹھ علمی اصطلاح میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ کسی چیز کا اسلامی ہونا موجبہ کلیہ ہے، جبکہ غیر اسلامی ہونا سالبہ جزئیہ ہے۔

اب ہم لبرل مغربی جمہوریت کے مذکورہ بنیادی اور اساسی اصولوں کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔اسکے بعد اس پر بحث کریں گے کہ اسلامی ممالک نے جمہوریت کو کن ترمیمات کے ساتھ بطورِ نظام کے قبول کیا، خصوصا پاکستان میں رائج جمہوری نظام پر اسلامی نکتہ نظر سے بحث کریں گے۔

لبرل مغربی جمہوریت کے اصول شریعت کے روشنی میں عوام کی کلی حاکمیت کا تصور

عوام کی کلی حاکمیت اور خودمختاری کا اصول اسلامی تعلیمات سے کلی طور پر متصادم ہے۔نصوص اللہ کی کلی حاکمیت اور احکام ِخداوندی کی ہر اعتبار سے بالادستی پر دلالت کرتے ہیں،ان الحکم الا للہ ، الا لہ الخلق و الامر، ان الدین عند اللہ الا الاسلام، و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ ،اوراس جیسی آیتیں تقاضا کرتی ہیں کہ بالادستی صرف اور صرف اللہ کے نازل کردہ دین کے لئے ہے۔لہٰذا اسلامی ریاست میں قانون سازی اللہ کی منشاء اور چاہت کے مطابق ہوگی اور دنیا میں اللہ کی چاہت کا مظہر صرف دینِ اسلام ہے،اس لئے لبرل مغربی جمہوریت کی اسلام کاری کرتے وقت عوام کی جزوی وکلی حاکمیت کے تصور کی بیخ کنی کرنی ہوگی اور ایسی ترمیم کرنی ہوگی کہ حکمران عوامی نمائندہ ہونے کی بجائے اللہ اور اس کے رسول کا نمائندہ ہو اور عوامی خواہشات کی بجائے اللہ اور اس کے رسول کی رضا اور خوشی کو مدنظر رکھے۔

پارلیمنٹ کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات

یہ اصول بھی شریعت سے متصادم اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔اسلامی ریاست میں قانون سازی صرف مباحات اور انتظامی امور میں ہوتی ہے،مسائل منصوصہ اور متفق علیہا مسائل بلا ترمیم وتبدیلی کے لاگو ہوتے ہیں،البتہ مسائل اجتہادیہ میں اہل اجتہاد اور اسلامی علوم کے ماہرین یعنی فقہا اور علماء حالات کے مطابق مخصوص حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کر سکتے ہیں۔لہٰذا جمہوریت کی اسلام کاری کرتے وقت پارلیمنٹ کے لامحدود اختیارات پر قدغن لگانا ہوگی،اس کے لئے علاوہ پارلیمنٹ چونکہ قانون ساز مجلس ہے،اس لئے اس کی اہلیت کے لئے وہی شرائط ہوں گی جو مسائل ونصوص میں بحث کے لئے ہوتی ہیں،کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے عوم اور شرعی علوم سے بے بہرہ افراد کے لئے تقلید واتباع کا حکم ہے۔خلاصہ یہ کہ اسلامی جمہوریت میں پارلیمنٹ سے متعلق دو باتیں طے کرنی ہوں گی:

ایک، پارلیمنٹ کے اختیارات کے حدود وقیود طے کرنا

دوم، پارلیمنٹ کے ممبر بننے کے لئے مخصوص شرائط لگانا

آئین ودستور کی ہر صورت میں بالادستی اور تقدس

آئین ودستور کی بالادستی، تقدس اور کلی حاکمیت کا اصول بھی شریعت کے منافی ہے۔قرآن وحدیث کے مطابق ہر صورت میں بالادستی صرف اور صرف اللہ کی نازل کردہ شریعت اور دین اسلام کی ہے۔ ہر ایسا اصول، قانون اور دستور جو شریعت کے متناقض ہو، دینِ اسلام کے مقابلے میں اس کی کچھ بھی حیثیت نہیں ہے،خواہ ملک کے تمام افراد بلا کسی اختلاف کے اسے قانون بنائیں لہٰذا جمہوریت کی اسلام کاری کے وقت ایک تو آئین اور دستور کو مکمل اسلامی شکل میں ڈھالنا ہوگا اور اس کے بعد بھی ایسا نظام بنانا ہوگا جس کی رو سے آئین اور دستور اسی وقت تک محترم ومقدس سمجھا جائے گا جب تک وہ شرعی تعلیمات پر مشتمل ہو۔اگر آئین اور دستور کی کوئی بھی شق شریعت کے خلاف ہو تو اسے ہر صورت میں کالعدم سمجھا جائے گا۔اسے کالعدم قرار دینے کے لئے نہ کسی سفارش کی ضرورت ہوگی اور نہ پارلیمنٹ کی دو تہائی

اکثریت کی۔ نیز پارلیمنٹ کا ہر ایسا پاس کیا ہوا قانون نا قابلِ قبول ہوگا جو شریعت سے متصادم ہو۔

بالغ رائے دہی اور سیاسی مساوات کا تصور

اس اصول کا خلاصہ دو باتیں ہیں:

نمبر۱۔ انتخابِ امیر کا حق ملک کے ہر بالغ فرد کو حاصل ہے ۔

نمبر۲۔ تمام افراد کی رائے کلی طور پر مساوی ہے۔

اس اصول کے دوسرے حصے کے بطلان پر نقل کے ساتھ عقل بھی واضح دلالت کرتی ہے کہ ہر آدمی کی رائے اور ہر آدمی کا مشورہ یکساں نہیں ہے۔ کیا عالم اور جاہل کی رائے برابر ہے؟ کیا عقل مند، صاحبِ حکمت اور فہم اور شعور رکھنے والے اور اجڈ، گنوار اور عقل وخرد سے عاری ایک انسان کی رائے یکساں ہو سکتی ہے؟ نیز عقل کے ساتھ یہ اصول شریعت کے بھی خلاف ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ” قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون، افمن كان مؤمناً كمن كان فاسقاً“ اور اس جیسی آیتیں نیک وبد، عالم وجاہل اور کافر ومومن کے فرق پر دلالت کرتی ہیں۔

اسی طرح آپ نے شیخین کے بارے میں فرمایا: ”لو اجتمعتما ما خالفتكما“ (مسند احمد) ”یعنی جب تم اتفاق کر لیتے ہو تو میں اس کی مخالفت نہیں کرتا“۔

گویا اس حدیث میں شیخین کی رائے کو باقی تمام صحابہ کی رائے پر فضیلت دی ہے۔

اس اصول کے پہلے حصے کے بارے میں چند باتیں پیش خدمت ہیں:

نمبر۱۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے انتخاب امیر میں مشورہ ضروری ہے البتہ اسلامی سیاست پر لکھنے والے تقریباً تمام مفکرین کا اتفاق ہے کہ مشورہ ہر ہر فرد سے لینے کی بجائے صرف اہلِ حل وعقد سے لیا جائے یعنی معاشرے کے وہ بااثر افراد جو دینی، دنیاوی اور علمی وجاہت رکھتے ہوں، لوگوں کی نظر میں محترم سمجھے جاتے ہوں اور لوگ ان کی بات اور رائے کو وقعت دیتے ہیں۔ اس بات پر تو بحث کی گنجائش ہے کہ اہلِ حل وعقد کو متعین کرنے کی صورتیں کیا کیا ہو سکتی ہیں؟ ویسے بھی معاشرے میں ذی وجاہت لوگ تقریباً ممتاز اور متعین ہوتے ہیں، تھوڑی سی چھان بین سے مزید ممتاز ہو سکتے ہیں۔ البتہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ انتخابِ امیر اہلِ حل وعقد کریں گے اور بقیہ تمام امت اس منتخب شدہ امیر کی اطاعت کی بیعت کرے گی۔

علامہ ماوردی الاحکام السلطانیہ میں لکھتے ہیں:

فان اجاب اليها بايعوه عليها وانعقدت ببيعتهم له الامامة فلزم كافة الامة الدخول فى بيعته والانقياد لطاعته (صفحہ۸)

اسی بات کو علامہ ابو یعلی نے الاحکام السلطانیہ میں (صفحہ 24) علامہ جوینی نے غیاثی میں (صفحہ 46) ابن خلدون نے مقدمہ میں (صفحہ 161) اور دیگر فقہاء نے کتاب الامارہ کے تحت ذکر کیا ہے۔

بلکہ مشہور محدث علامہ نووی نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اہلِ حل وعد سے امامت منعقد ہو جائے گی۔ چنانچہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

واجمعوا علی انعقاد الخلافة باالاستخلاف وعلی انعقادها بعقد اهلِ الحل والعقدلانسان اذالم یستخلف الخلیفة

نمبر۲۔فقہاء کی تصریحات کے ساتھ خلفاء راشدین کا طریقہ انتخاب بھی اس کی تائید کرتا ہے، کیونکہ حضرت ابوبکر، حضرت عثمان اور حضرت علی کی خلافت اہلِ حل وعقد کی بیعت سے منعقد ہوگئی، پھر بقیہ امت نے بیعتِ طاعت کی۔ بلکہ حضرت علی کو جب باغی ٹولے نے خلافت کی پیش کش کی تو حضرت علی نے فرمایا:

لیس ذلك الیکم انما هو لاهل الشوری و اهل بدر (الامامہ والسیاسہ لابن قتیبہ)

خلفاء راشدین کے انتخاب میں اس وقت کے سرکردہ افراد کے علاوہ بقیہ تمام سلطنت میں سے کسی شخص کی رائے نہیں لی گئی، اگر اسلامی تعلیمات کی رو سے انتخابِ امیر ہر شخص کا حق ہے، تو خلفاء راشدین امت کے اس حق کو کیسے پامال کر سکتے تھے۔ نیز اس زمانے میں پوری اسلامی قلم رو سے کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کا طرزِ عمل دلالت کرتا ہے، کہ انتخاب امیر ہر شخص کا حق نہیں ہے، بلکہ امت کے ذی شعور، عقل مند اور علم سے بہرور افراد اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلیفہ کا انتخاب کریں گے۔

نمبر۳۔بعض معاصرین نے اس بارے میں یہ رائے اختیار کی ہے کہ اہلِ حل وعقد کا فریضہ انتخاب کی بجائے محض نامزدگی ہے کہ وہ اپنے فہم سے خلافت کے لئے شخص کو نامزد کرتے ہیں، پھر بقیہ امت کی بیعت سے اس کی امامت منعقد ہوتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ محض نظریہ ہے۔ خلفاء راشدین کا طریقہ انتخاب اور فقہاء کی تصریحات اس کی تائید نہیں کرتیں۔ اگر واقعی بات ایسی ہے، تو فقہاء اہلِ حل وعقد کی بیعت کو بیعتِ انعقاد اور بقیہ امت کی بیعت کو بیعتِ طاعت کیوں کہتے ہیں؟ نیز علامہ ماوردی اور دیگر مفکرین کی عبارات واضح دلالت کرتی ہیں کہ اہلِ حل وعقد کی بیعت سے خلافت منعقد ہو جاتی ہے ، بلکہ امام جوینی نے باقاعدہ ان افراد کو الگ عنوان کے تحت ذکر کیا جو انتخابِ امام کے اہل نہیں ہیں (دیکھئے صفحہ 46 تا صفحہ 50) اور بقیہ امت پر اس امام کی اطاعت کی بیعت لازم ہو جاتی ہے۔

نمبر۵۔سیاسیاتِ اسلامیہ پر لکھنے والے کچھ معاصر مفکرین نے جو مذکورہ نظریہ اختیار کیا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے ، کہ ان کے بقول انعقاد کا حق صرف اہلِ حل وعقد کو دینا اور بقیہ امت کے افراد کو محروم کرنا ایک قسم کا استبداد ہے اور یہ طریقہ کار عوام کی غلامی اور مقہوریت کی ایک شکل ہے۔ حالانکہ اسلام ہر فرد کو اپنی رائے کے جائز اظہار میں مکمل آزادی فراہم کرتا ہے، لیکن اس قسم کے شبہات محض نظری ہیں۔ کیونکہ اہلِ حل وعقد کوئی خاص طبقہ، خاص جماعت اور خاص گروہ کا نام نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کے زیرک، باشعور اور دینی و دنیاوی وجاہت والے افراد کو اہلِ حل وعقد کہا جاتا ہے ،خواہ ان کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو۔ ہر فرد کو انتخاب کا حق دینے سے عام طور پر اہلیت رکھنے والا شخص منتخب نہیں ہوتا ، کیونکہ عوام کی اکثریت فہم وشعور، علم وادراک اور صحیح افراد کی پہچان سے قاصر ہوتی ہے۔ نیز معاشرے کے ذی وجاہت

لوگوں کی رائے عموماً پورے معاشرے کی رائے سمجھی جاتی ہے۔لہذا جب ہر علاقے، ہر صوبے اور ہر خطے کے معاملہ فہم افراد انتخاب میں شریک ہیں تو یہ استبداد کے زمرے میں کیسے آتا ہے؟ اگر یہ استبداد ہے تو استبداد کی یہ شکل لبرل مغربی جمہوریت میں بھی پائی جاتی ہے کہ پارلیمانی نظام میں وزیرِ اعظم کے انتخاب کا فیصلہ ارکانِ پارلیمنٹ کرتے ہیں اور ملکی عوام براہِ راست اس انتخاب میں حصہ نہیں لیتے۔

خلاصہ یہ نکلا جمہوریت کی اسلام کاری میں اس اصول میں ایک تو یہ ترمیم کرنی ہوگی، کہ انتخاب امیر اور ملکی نظم ونسق اہلِ حل وعقد کے مشورے سے چلانا ہوگا۔البتہ اہلِ حل وعقد پر مبنی مجلسِ شوریٰ میں عوام سے مشورہ لیا جاسکتا ہے، لیکن عوام کی رائے لازم نہیں ہوگی۔اس میں عوام کی رائے کے علاوہ دیگر شرائطِ اہلیت کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔نیز اسلامی تعلیمات کی رو سے چونکہ اپنا تزکیہ، اپنی اہلیت اور اپنی دین داری کا دعویٰ کرنا نہایت غیر مستحسن امر ہے۔اس لئے اہلِ حل وعقد کے مجلس شوریٰ کا رکن بننے کے لئے جو فرد مطالبہ کرے، اس پر اشتہاری مہم چلائے اور اپنی نامزدگی کے بارے میں پروپیگنڈہ کرے، تو اس کی اہلیت محلِ نظر ہوگی۔اس کی مثال یوں ہے کہ لبرل مغربی جمہوریت میں جب نگران وزیرِ اعظم کا معاملہ آتا ہے، تو اگر کوئی خود نگران وزیرِ اعظم بننے کا مطالبہ کرے، اس پر دلائل دے اور اپنی غیر جانبداری کا پروپیگنڈہ کرے، تو اس کو رد کیا جاتا ہے، بلکہ ایک ایسے شخص کو نگران وزیرِ اعظم نامزد کیا جاتا ہے، جس کی غیر جانبداری کی گواہی دوسرے لوگ دیں۔اس کے علاوہ مشورہ دینا چونکہ اہلِ حل وعقد کی ایک ذمہ داری اور ایک امانت ہے، اس لئے اس پر وہ بھاری بھرکم معاوضات کے مستحق بھی نہیں ہوں گے، اس لئے اسلامی جمہوریت میں اہلِ حل وعقد محض خیر خواہی اور امتِ مسلمہ کی بہتری کے لئے مشورہ اور رائے دیں گے۔جب یہ منصب مالی فوائد سے خالی ہوگا، تو مقاصدِ شریعت مزید بہتر انداز میں حاصل ہوں گے، کیونکہ مالی فوائد کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طرف ہر کسی کی رغبت بھی نہیں ہوگی اور یوں درست افراد کے انتخاب تک رسائی زیادہ بہتر اور آسان ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت کی اسلام کاری میں اس اصول میں درجہ ذیل ترمیمات کرنی ھوگی۔

نمبر۱۔انتخاب امیر کا حق صرف اہل حل وعقد کو ہوگا، ملک کا ہر شخص اس میں حصہ دار نہیں ہوگا۔

نمبر۲۔ اہل حل وعقد صرف مشورہ اور رائے کا فریضہ سرانجام دیں گے۔اس کام پر نہ تو ان کو معاوضہ دیا جائے گا اور نہ وہ اکثریت کے بل بوتے پر حکومت پر اثر انداز ہوں گے۔

نمبر۳۔ایک مرتبہ جب اہل حل وعقد متعین ہو جائے تو مختلف عوامل کی بنیاد پر اس میں کمی بیشی تو ہوگی، لیکن یہ اصول درست نہیں ہوگا کہ ایک مخصوص مدت تک تو وہ اہل حل وعقد ہوں، ان کی عقل، ان کا فہم، مسلم ہو، پھر دوسری مدت میں ان کی عقل مندی کالعدم ہو جائے اور نئے اہل حل وعقد کی تلاش شروع ہو جائے۔باقی قانون سازی تو اہل حل وعقد میں سے صرف وہی لوگ کریں گے جو دینی علوم کے ماہر ہوں، اگرچہ دنیاوی معاملات میں ماہرین سے حقیقت حال معلوم کر کے ہی اس پر کوئی شرعی حکم لگایا جائے گا۔

یعنی جمہوریت کی اسلام کاری میں بالغ رائے دہی اور ہر رائے کی برابری کے اصول میں اسلامی تعلیمات اور

مقاصدِ شریعت کے مطابق مناسب ترمیمات کرنی ہوگی۔

کثرتِ رائے کی حتمیت کا اصول

کثرتِ رائے نہ تو اتنی بری چیز ہے کہ کسی بھی اعتبار سے قابلِ التفات نہیں ہے اور نہ اتنی اچھی ہے کہ ہر حال میں، ہر صورت میں اس کو ماننا لازمی اور حتمی ہے۔ اسلام کا اصول تو یہ ہے کہ الحق احق ان یتبع کہ اختلافِ رائے کے وقت دلائل اور قرائن سے جو رائے حق کے قریب ہو، اسی کو اختیار کیا جائے خواہ اقلیت کی رائے ہو یا اکثریت کی۔ کسی رائے کے حق میں کثرت کی موافقت بھی اگرچہ اس کے حق اور درست ہونے کے قرائن میں سے ایک قرینہ ہے، لیکن یہی آخری اور حتمی قرینہ نہیں ہے۔ درحقیقت لبرل مغربی جمہوریت کا یہی وہ اصول ہے جس کی مدد سے ملک میں خلافِ عقل، خلافِ تہذیب اور خلافِ انسانیت اور اغراض پر مبنی ہر قسم کی قانون سازی ہو سکتی ہے۔ اسی اصول کا کرشمہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں افراد کے کردار، فہم وشعور اور تعلیم وتربیت کی بجائے کثرت اور محض کثرت کے لئے کوشاں رہتی ہیں اور یوں ملک میں مفاد پرستوں کا ایک ایسا ٹولہ وجود میں آجاتا ہے جو اقتدار وحکومت کے لئے اپنی پارٹیاں اور وفاداریاں ہر مدت کے بعد تبدیل کرتا ہے، کیونکہ جمہوریت کا نظام صرف اور صرف کثرت کی صورت میں سیاسی جماعتوں اور شخصیات کی رائے کو وقعت دیتا ہے نہ کہ دلائل، قرائن اور دیگر عوامل کی بنیاد بنا پر۔ لہٰذا لبرل جمہوریت کی اسلام کاری کرتے وقت اس اصول میں یہ ترمیمات کرنی ہوگی۔

۱۔ مسائل منصوصہ اور متفقہ مسائل میں کثرتِ رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

2۔ مسائلِ اجتہادیہ اور انتظامی امور میں کثرتِ رائے کا اعتبار کیا جائے گا، البتہ حالات اور دلائل کے اعتبار سے اقلیت کی رائے بھی اختیار کی جا سکے گی۔

3۔ کثرتِ رائے کو ماننا قانوناً لازمی اور حتمی نہیں ہوگا۔

غرض کوئی ایسا طریقہ اپنایا جائے گا جس کی رو سے کثرتِ رائے کی حتمیت اور لزوم ختم ہو جائے، کیونکہ کثرتِ رائے کی ہر اعتبار سے حتمیت اسلامی تعلیمات اور مقاصد الشریعہ سے کسی طرح سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

سیاسی جماعتوں اور حزبِ اختلاف کا تصور

لبرل مغربی جمہوریت میں حصول اقتدار کے لئے نسلی، لسانی، علاقائی، ثقافتی اور نظریاتی بنیادوں پر مختلف سیاسی جماعتیں بنتی ہیں۔ پھر جو جماعتیں دو تہائی اکثریت حاصل کر لیتی ہیں۔ وہ اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان ہو جاتی ہیں اور بقیہ جماعتیں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں۔ جمہوریت کی اسلام کاری میں یہ سوال نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ کیا اسلامی تعلیمات کی رو سے اسلامی ریاست میں مختلف سیاسی جماعتوں کی گنجائش ہے یا نہیں؟ نیز اسلامی ریاست میں حزبِ اختلاف کا تصور کس حد تک درست ہے؟ گویا یہاں دو باتیں قابلِ تنقیح ہیں۔

نمبر ا۔ حصولِ اقتدار کے لئے مختلف بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانا

نمبر ۲۔ حزبِ اختلاف کا حکم

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، تو لبرل مغربی جمہوریت میں سیاسی جماعتیں بنانے کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ پارلیمنٹ ایک مکمل خود مختار قانون ساز ادارہ ہوتا ہے اور عمومی طور پر جمہوری ملکوں میں جس قسم کے لوگوں کی کثرت ہوتی ہے، وہ ایسی قانون سازی کی کوشش کرتے ہیں، جن سے ان کے خاص مقاصد زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ملک کے دیگر طبقات کے فوائد، مقاصد اور نظریات پر منفی اثر پڑتا ہے، اس لئے ہر زبان، ہر نسل، ہر علاقے اور ہر طبقے والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ سیاسی جماعتیں بنا کر پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرے تاکہ ان کے مفادات متاثر نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کے اعتبار سے مکمل خود مختاری اور کثرتِ رائے کا حتمی ہونا ہی دراصل ملک میں مختلف سیاسی جماعتوں کی بنیاد بنتا ہے۔ جبکہ صحیح اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، کیونکہ مجلس شوریٰ کو مسائل منصوصہ اور متفقہ میں ترمیم کا اختیار نہیں ہوتا۔ مسائل اجتہادیہ اور انتظامی امور میں بھی قانون سازی شریعت کے مقرر کردہ حدود اور قیود کے اندر ہوتی ہے، اس لئے عموماً ملک کے کسی طبقے کے فوائد پر خاص اثر نہیں پڑتا، کیونکہ اسلامی قوانین اور اصول کسی خاص طبقے کی سوچ اور فکر کا نتیجہ نہیں، بلکہ احکم الحاکمین کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ ان میں انسانیت کے ہر طبقے کی ضروریات وحوائج کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے اگر اسلامی تعلیمات کے مطابق ادارہ پارلیمنٹ اور کثرتِ رائے کا اصول کی اصلاح کی جائے تو سیاسی جماعتوں کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ بحث پھر بھی رہ جاتی ہے کہ اسلامی نکتہ نظر سے ایک اسلامی ریاست میں مختلف بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانے کا کیا حکم ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نسلی، علاقائی، لسانی ثقافتی اور نظریاتی اعتبارات سے سیاسی جماعتیں بنانا اسلامی تعلیمات اور مقاصدِ شریعت سے مختلف وجوہ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

ا۔ مسلمان بحیثیت امت ایک گروہ اور جماعت شمار ہوتے ہیں اور ان بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانا اتحادِ امت کو پارہ پارہ کر دیتی ہے، جبکہ امت کا اتحاد واتفاق برقرار رکھنا شریعت کے اعظم مقاصد میں سے ہے۔

2۔ مختلف بنیادوں پر سیاسی جماعتوں کی وجہ سے عصبیت اور قومیت کے جذبات ابھرتے ہیں اور اسلام اس عصبیت، رنگ ونسل کے اعتبار سے تفریق اور رنگ ونسل کی بنیاد پر گروہ بندی کا شدت کے ساتھ رد کرتا ہے۔

3۔ سیاسی جماعتوں میں عام طور پر جذبہ رقابت کی بنیاد پر نفرت اور ایک دوسرے سے بغض وعناد ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آپس میں گالی گلوچ، طعنہ زنی، بہتان تراشی، اور ایک دوسرے کی غیبت کا بازار گرم ہوتا ہے اور بسا اوقات قتل و غارت تک نوبت پہنچ جاتی ہے خصوصاً الیکشن کے قریب پورا معاشرہ ان برائیوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے جیسا کہ عام مشاہدہ ہے۔ جبکہ مسلم معاشرے سے یہ مفاسد اور ان کو جنم دینے والے ذرائع کو جڑ سے اکھاڑنا شریعت کے اعظم مقاصد میں سے ہے۔

4۔ جب ہر سیاسی جماعت کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طریقے سے اقتدار تک پہنچ جائے، تو بسا اوقات کچھ جماعتیں اس مقصد کے حصول کی خاطر کفریہ طاقتوں اور عالمی استعمار کی آلہ کار بھی بن جاتی ہیں اور یوں اسلامی معاشرے کے

اندر سے منافقین اور کفریہ طاقتوں کے مقاصد پورا کرنے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کی اسلامی ریاست اور مسلم معاشرہ طرح کی مشکلات اور سازشوں کا شکار رہتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلم ممالک میں پھیلے سازشوں کے جال در جال میں سیاسی شخصیات اور جماعتوں کا بڑا کردار ہے۔

5۔ ہماری پوری اسلامی تاریخ اس قسم کی سیاسی جماعتوں کے وجود سے خالی ہے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب بھی کسی چیز کے مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ ہونے یا نہ ہونے پر واضح قرینہ ہے۔ ماضی میں اس کی کسی قسم کی نظیر نہ ملنا دلالت کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں مختلف بنیادوں پر سیاسی جماعتیں بنانا مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ باقی ثقیفہ بنی ساعدہ کے مباحث، مہاجرین وانصار کے گروہ، جنگِ صفین اور جنگِ جمل کے واقعات اور واقعہ کربلا سے استشہاد دراصل سیاسی جماعتوں کے مفہوم، مقصد اور ان تاریخی واقعات کے اصل پسِ منظر سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ عصرِ حاضر کی سیاسی جماعتوں اور ان تاریخی حوادث میں کسی طرح سے مماثلت نہیں ہے۔

6۔ بعض معاصرین کی رائے یہ ہے کہ امارت وحکومت تک پہنچنے کے لئے تو سیاسی جماعتوں کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کام اہلِ حل وعقد سر انجام دیں گے، البتہ مختلف وزارتوں اور مختلف علاقوں کی ولایت اور سربراہی کے لئے سیاسی جماعتوں کی ضرورت ہے تاکہ امیر پوری ریاست میں صرف اپنی پسند کے لوگوں کو تعینات نہ کرے، لیکن ظاہر ہے کہ جب سیاسی جماعتیں بنیں گی خواہ حکومت کے لئے ہو یا وزارت کے لئے، مذکورہ مفاسد اور برائیاں خود بخود پیدا ہوں گی اس لئے وزارت اور صوبوں کے سربراہ چننے کے لئے کوئی اور ایسا طریقہ کار اختیار کیا جاسکتا ہے، جس میں مذکورہ مفاسد نہ ہوں مثلاً اہلِ حل وعقد جس طرح انتخابِ امیر کا کام کرتا ہے اسی طرح یہ کام بھی ان کے سپرد ہو۔ اس میں بھی کوئی خلافِ شریعت بات نہیں وغیرہ۔ غرض سیاسی جماعتوں سے مسلم معاشرے کو پاک کرنا مختلف وجوہ کی بناء پر اسلامی ریاست کے لئے بہت ضروری ہے۔

اس کے بعد مرحلہ آتا ہے حزبِ اختلاف کا کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے حزبِ اختلاف کا تصور کیا ہے؟ تو اس بارے میں چند باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

1۔ لبرل جمہوری ملکوں میں حزبِ اختلاف کا کردار الیکشن میں ہاری ہوئی جماعتیں ادا کرتی ہیں۔ جب اسلامی ریاست میں اس قسم کی سیاسی جماعتوں کا تصور نہیں ہے تو حزبِ اختلاف بھی نہیں رہے گا۔

2۔ امیر اور خلیفہ کی اطاعت اور اسلامی ریاست میں انارکی نہ پھیلانا شہریت کے بڑے مقاصد میں سے ہے۔ اس پر امیر کی اطاعت پر دلالت کرنے والے نصوص اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے والی روایات شاہد ہیں۔ جبکہ حزبِ اختلاف کا تصور ان مقاصد کے حصول میں رکاوٹ ہے۔ اس لئے حزبِ اختلاف اسلامی ریاست سے میل نہیں کھاتا۔

3۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب پریشر گروپ نہیں ہوگا تو حکمران مطلق العنان نہ بن جائیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں اس کا حل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں موجود ہے۔ اور سلطانِ جائر

کے سامنے کلمہ حق کہنا شریعت کی رو سے افضل جہاد ہے، اس لئے اسلامی معاشرے میں نیک، نڈر اور اسلامی غیرت سے سرشار لوگ یہ فریضہ اور جہاد خود بخود کرتے رہتے ہیں، خواہ اس کے لئے اداراتی حد بندی نہ ہو۔ ہماری تاریخ اس قسم کی مثالوں اور واقعات سے مزین ہے۔

4۔ اسلامی ریاست میں فسق، غیر شرعی امور اور ظلم سے امیر مستحق عزل ہوتا ہے اور بعض حالات میں اہلِ حل وعقد اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔ تو عزل کی تلوار بھی حکمران کی مطلق العنانیت کے لئے مانع ہوتی ہے۔ اس لئے الگ حزبِ اختلاف قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

5۔ عام طور پر حزبِ اختلاف حکومت پر نکتہ چینی خیر خواہی کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ اگلی مدت میں اقتدار کے حصول کے لئے عوام کو حکمرانوں سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے عام طور پر حزبِ اختلاف کے پروپیگنڈے اور افواہوں میں سچائی کا عنصر کافی کم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حزبِ اختلاف کی وجہ سے معاشرہ ہمیشہ اپنے حکمرانوں سے شاکی رہتا ہے اور پورے معاشرے میں بے یقینی کی کیفیت سی رہتی ہے، جیسا کہ ہمارے ملک میں اس کا عام مشاہدہ ہے۔

الغرض حزبِ اختلاف کا تصور خالص لبرل جمہوریت کی دین ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس کے مثالی متبادل موجود ہیں، اس لئے جمہوریت کی اسلام کاری کرتے وقت حزبِ اختلاف کے موجودہ تصور اور نظام کو مکمل طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔

(جاری)

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہ کی نئی تصنیف

جاوید احمد غامدی کے شاگرد عمار خان کا

نیا اسلام اور اس کی سرکوبی

[صفحات: ۴۳۰]

چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ ہر بڑے کتب خانہ پر دستیاب ہے

امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے مولانا عبدالقدوس قارن صاحب سے فرمایا: ایہہ (عمار) ناصر کیہڑے پاسے ٹر پیا اے؟ تسی اینوں روکدے کیوں نئیں؟ توں تے اوہدا استاد وی ایں۔ اونوں سختی نال روکو! (الشریعہ، جولائی ۲۰۱۳ء) ''یہ ناصر کس طرف چل نکلا ہے؟ تم اسے روکتے کیوں نہیں؟ تم تو اس کے استاد بھی ہو، اس کو سختی سے روکو۔''

ناشر: دارالامین، لاہور 0300-5687800